احسن العقائد

اردو ترجمہ

شرح باب حادی عشر

تصنیف

سرکار علامہ حلّی علیہ الرحمۃ

شارح

علامہ فاضل مقداد علیہ الرحمۃ

اصولِ دین
توحید
عدل
نبوّت
اِمامت
معاد

ناشر

رحمت اللہ بک ایجنسی

بالمقابل بڑا امام باڑہ، کھارادر، کراچی ۷۴۰۰۰

فون ۲۴۳۱۵۷۷

سید ذوالفقار علی شاہ مشہدی

احسن العقائد

اُردو ترجمہ

شرح باب حادی عشر

تصنیف

سرکار علامہ حلّی علیہ الرحمۃ

شارح

علامہ فاضل مقداد علیہ الرحمۃ

ترجمہ و تشریح

علامہ السید محمد قاسم صاحب قبلہ زیدی مدظلہ العالی

ناشر

رحمت اللہ بک ایجنسی

بالمقابل بڑا امام باڑہ، کھارادر، کراچی ۷۴۰۰۰

قال العلامۃ: تیسرا مبحث اس بیان میں ہے کہ نبی اول عمر سے آخر عمر تک معصوم ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا اول عمر سے آخر عمر تک معصوم ہونا اس لیے ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی غرض ان حضرات کے لیے عام انسانوں کی اطاعت تامہ کا حاصل ہونا ہے اور جس شخص سے اس کی عمر کے کسی حصہ میں بھی گناہان کبیرہ و صغیرہ و موجب نفرت افعال کا صدور ہوگا۔ اس کے لیے عام انسانوں کی اطاعت تامہ حاصل نہیں ہو سکتی۔

قال الشارح: فرقہ امامیہ کے علاوہ جو لوگ عصمت انبیاء کے قائل ہیں۔ وہ اس امر کے قائل ہیں کہ انبیاء بعد نزول وحی معصوم ہوتے ہیں۔ لیکن نزول وحی سے قبل یہ لوگ عصمت انبیاء کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ اس بات کے قائل ہیں کہ نزول وحی سے قبل انبیاء کافر نہیں ہوتے۔ اور نہ گناہوں پر اصرار ہوتا ہے۔ صدور گناہ عمداً ہو سکتا ہے۔

فرقہ شیعہ

فرقہ شیعہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت مطلقہ کا قائل ہے۔ انبیاء علیہم السلام سے کوئی گناہ نہ قبل وحی ہو سکتا ہے۔ اور نہ بعد وحی آخر عمر تک ان سے کوئی گناہ ہو سکتا ہے۔ اس عصمت پر دلیل وہی ہے جس کو علامہ نے ذکر فرمایا ہے۔ قرآن مجید کی بعض آیات و نیز بعض احادیث جن سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہوا ان آیات و احادیث میں صدور گناہ سے مراد ترک اولیٰ ہے تاکہ عقل و نقل میں مخالفت لازم نہ آئے علاوہ ازیں ان تمام آیات و احادیث کی تاویلات بیان کر دی گئی ہیں۔ جو اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص ان تاویلات کو دیکھنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ جناب سید مرتضیٰ

علم الہدیٰ کی کتاب تنزیہ الانبیاء و دیگر علمائے اعلام کی کتابوں کا مطالعہ کرے۔ اگر کتاب کے طولانی ہوجانے کا خوف نہ ہوتا۔ تو ہم اس مقام پر کچھ تاویلات کو ذکر کرتے:

تشریح مترجم

انبیاء و ائمہ علیہم السلام ابتدائے عمر سے آخر عمر تک معصوم ہوتے ہیں۔ اعلان نبوت و امامت سے قبل ان حضرات کا معصوم ہونا اس لیے ضروری ہے کہ عدم عصمت کی صورت میں ان حضرات کو خلق کی اطاعت تامہ حاصل نہ ہوگی جو ان کی نبوت و امامت کی غرض ہے کہ گذشتہ زمانہ کے گناہ اطاعت کے لیے مانع قرار پائیں گے۔

اعلان نبوت و امامت کے بعد ان حضرات کا معصوم ہونا اس لیے ضروری ہے کہ نبی مبلغ شریعت اور امام محافظ شریعت ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ ورنہ عدم عصمت نبی کی صورت میں احکام خدا یقینی احکام خدا نہ ہیں گے۔ اور عدم عصمت امام کی صورت میں شریعت زیادتی و کمی سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ و علیٰ ہذا نبی و امام کے لیے سہو و نسیان کی تجویز بھی باطل ہے۔ سہو و نسیان کی تجویز کی صورت میں وہی خرابی لازم آئے گی جو تجویز صدور گناہ کی صورت میں لازم آتی ہے۔ قرآن مجید کی بعض آیات سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے صدور گناہ ہوا مثلاً حضرت آدمؑ کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

عَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی — آدم نے اپنے رب کا عصیان کیا پس وہ نقصان میں رہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے۔

فَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ — اے رسول اپنے گناہ کے لیے استغفار کرو

اسی طریقے سے بعض انبیاء کے لیے ظلم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس قسم کی تمام آیات کی تاویل واجب ہے۔ اس لیے کہ عقل و نقل کے تعارض کی صورت میں نقل واجب التاویل ہو جاتی ہے۔ مثلاً باری تعالیٰ کا جسم جسمانیات سے منزہ ہونا بدلائل عقلیہ ثابت ہے اور قرآن کی بعض آیات سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ و چہرہ ہے ارشاد ہوتا ہے:

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ — اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ — تم جس طرف بھی اپنا رخ کرو گے وہیں اللہ کا چہرہ ہے

ان آیتوں کا ظاہری ترجمہ اس امر کا وہم پیدا کرتا ہے کہ اللہ کے لیے ہاتھ اور چہرہ ہے اس مقام پر عقل و نقل میں تعارض ہے پس ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہے کہ عقل پر عمل کریں اور نقل میں تاویل کریں یعنی نقل کے معنی عقل کے مطابق مراد لیں۔ اس لیے کہ اگر یہ صورت اختیار نہ کی جائے گی تو یا عقل و نقل دونوں پر عمل کیا جائے گا یا دونوں کو ترک کر دیا جائے گا اور یا نقل پر عمل کیا جائے گا اور عقل کو چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ تینوں صورتیں باطل ہیں۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ پہلی صورت میں اجتماع نقیضین لازم آتا ہے اور دوسری صورت میں ارتفاع نقیضین لازم آتا ہے۔ اور اجتماع نقیضین و ارتفاع نقیضین دونوں محال ہیں۔ تیسری صورت یعنی نقل پر عمل کرنا اور عقل کو چھوڑ دینا۔ اس صورت میں نقل کو بھی چھوڑنا لازم آئے گا۔ اس لیے کہ نقل کو سمجھنے کا ذریعہ ہمارے پاس عقل ہی ہے۔ اور عقل کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نقل کو سمجھنے کا

ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ رہے گا اس لیے نقل بھی چھوٹ جائے گی۔

ان آیتوں میں یَد سے مراد قوت و طاقت ہے۔ اور وجہ سے مراد کوئی مقام اور جہت ہے۔ اور کسی مقام پر وجہ سے مراد وہ ہستیاں ہیں جو اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں۔ اس لیے کہ وجہ ہر شئی کا وہ ہے جس سے اس شئے کی معرفت ہو۔ اس طریقہ سے ان آیات کی تاویل ضروری ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے گناہ کا صدور ہوا۔ کیونکہ دلیل عقلی سے ثابت ہو چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔

علمائے کرام رحمہم اللہ نے ان آیات کریمہ کے ان کے معانی عقل کے مطابق بیان کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کی کتاب تنزیہ الانبیاء زیادہ مشہور ہے۔ بعض آیات کے معانی ہم بھی بیان کرتے ہیں، جن میں تاویلات کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حضرت آدم علی نبینا و آلہ و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ارشاد ہے:

عَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی — آدم نے اپنے رب کا عصیان کیا۔ پس مراد کو نہ پہنچے۔

اس آیت کے ظاہری ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے گناہ صادر ہوا۔

جواب: لغت میں عصیان کے معنی گناہ کے نہیں ہیں بلکہ عصیان کے معنی خلاف الطاعۃ ہے (صحاح جوہری لغت عصٰی) یعنی طاعت کی ضد کو عصیان کہتے ہیں۔ اور اطاعت کی چار قسمیں ہیں:

(۱) امر واجب میں اطاعت (۲) امر مستحب میں اطاعت (۳) ترک حرام میں اطاعت (۴) ترک مکروہ میں اطاعت۔ پس اطاعت کی ضد یعنی عصیان کی بھی چار قسمیں قرار پائیں۔

(۱) امرِ واجب کے ترک میں عصیان (۲) امرِ مستحب کے ترک میں عصیان (۳) ارتکاب فعل حرام میں عصیان (۴) ارتکاب فعل مکروہ میں عصیان

ہماری اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ عصیان کا کوئی مستقل مفہوم نہیں ہے۔ بلکہ جس قسم کا امر یا نہی ہوگی۔ اسی حیثیت کا عصیان ہوگا۔ اگر امرِ واجب کو ترک کیا ہے تو امرِ واجب میں عصیان ہوگا جو گناہ ہے۔ اگر امرِ مستحب کو ترک کیا ہے تو امرِ مستحب میں عصیان ہوگا جو گناہ نہیں ہے۔ اگر فعل حرام کا ارتکاب کیا ہے تو فعل حرام میں عصیان ہوگا جو گناہ ہے۔ اور اگر امرِ مکروہ بجا لایا ہے تو امرِ مکروہ میں عصیان ہوگا جو گناہ نہیں ہے۔ جناب آدم علیہ السلام کا عصیان

لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ — اے آدم و حوا تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا

کے تابع ہوگا۔ اگر لا تقربا حرمت کے لیے تو فعل حرام میں عصیان ہوگا جو گناہ ہے۔ اور اگر لا تقربا کراہت کے لیے ہے تو فعل مکروہ میں عصیان ہوگا جو گناہ نہیں ہے۔

آیت مذکورہ میں لا تقربا حرمت کے لیے نہیں ہے بلکہ کراہت کے لیے ہے یعنی درخت کے قریب جانا آدم و حوا پر حرام نہ تھا بلکہ مکروہ تھا (لا تقربا فعل نہی ہے۔ اور فعل نہی کا استعمال حرام و مکروہ دونوں میں ہوتا ہے) جس کی دلیل یہ ہے کہ فعل حرام پر نبی اور اس کی امت مواخذہ میں برابر ہیں۔ فعل حرام پر جس طریقہ سے نبی قابلِ مواخذہ ہے۔ اسی طریقے سے ایک امتی بھی قابلِ مواخذہ ہے۔ درخت کے قریب جانے کے لیے آدم و حوا دونوں کو منع فرمایا گیا تھا لا تقربا تثنیہ کا صیغہ ہے۔ درخت کے قریب جانے میں دونوں شریک، کھانے میں دونوں شریک، نیز آثار کے ظاہر ہونے میں دونوں شریک ہیں۔ لیکن جب اس فعل پر مواخذہ کا وقت آیا تو حوا کو نظرانداز کر دیا گیا۔ آدم قابلِ مواخذہ قرار پائے

جیسا کہ ارشاد ہے:

عَصٰىٓ اٰدَمُ رَبَّهٗ — آدم نے اپنے رب کا عصیان کیا

عصیان کو آدم کے ساتھ مخصوص فرمایا اور حوا کو نظر انداز فرما دینا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ فعل حوا کے لیے ایسا عصیان نہیں تھا جو قابل مواخذہ قرار پاتا۔ اور وہ عصیان جو امت کے لیے قابل مواخذہ نہ قرار پائے فعل کروہ یا ترک مستحب ہی کے متعلق ہو سکتا ہے۔ امت سے مکروہات سرزد ہوتے ہی رہتے ہیں۔ البتہ نبی سے اس کے تقرب کی وجہ سے فعل کروہ و ترک مستحب پر بھی مواخذہ ہو سکتا ہے۔ جس کی بیّن مثال یہ ہے کہ اگر ایک شریف شخص کا لڑکا اور اس کا ایک ملازم بازار میں شاہ راہ عام پر کھڑے ہو کر کھانا کھالیں۔ تو یہ شخص اپنے ملازم سے اس فعل پر کوئی باز پرس نہ کرے گا کیوں کہ ملازموں سے اس قسم کے افعال ہوتے ہی رہتے ہیں مواخذہ کیسا۔ البتہ یہ شخص اپنے لڑکے سے ضرور باز پرس کرے گا کہ تم نے یہ فعل کیوں کیا۔ درآں حالیکہ لڑکے کے لیے یہ فعل حرام نہیں ہے مگر قابل مواخذہ ہے۔ کیوں کہ لڑکے کا یہ فعل تقاضائے شرافت کے منافی ہے۔ اگرچہ حرام نہیں ہے۔ ایسے افعال کے بجالانے کو ترک اولیٰ کہا جاتا ہے یعنی اس فعل کا ترک بہتر تھا۔ بس ثابت ہوا کہ حضرت آدم کا وہ فعل جس پر عَصٰىٓ اٰدَمُ رَبَّهٗ فرمایا گیا ہے مکروہ تھا نہ کہ حرام۔ فعل مکروہ جس کا ترک کرنا اولیٰ تھا۔ پس آدم علیہ السلام کو گنہگار نہیں کہا جا سکتا۔

اب رہا فَغَوٰى۔ فغوی پر فائے تفریع ہے۔ یعنی جس قسم کا عصیان ہے اسی قسم کی غوایت و مراد کو نہ پہنچنا ہے۔ عصیان چونکہ فعل مکروہ سے متعلق ہے لہٰذا غوی کے معنی یہ ہوئے کہ آدم کو اس فعل کے ترک پر جو ثواب حاصل ہوتا۔ اوس سے محروم ہو گئے۔

اسی مقام سے ان آیات کا بھی حل ہو جاتا ہے۔ جن آیات میں انبیاء علیہم السلام نے اپنے نفسوں کی طرف ظلم کو منسوب فرمایا ہے۔ کسی مقام پر رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ رالے

پالنے والے ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا)

اور کسی مقام پر

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا — اے ہمارے پالنے والے ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا

فرمایا گیا ہے۔ ان آیات میں ترک اولیٰ کو ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ ان تمام آیات میں انبیاء علیہم السلام نے ظلم کو اپنے نفسوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور اپنے نفس پر ظلم کی وہی چار حیثیتیں ہیں جن کی تشریح ہم کر چکے ہیں۔ اگر ترک واجب یا فعل حرام کے متعلق ظلم ہے تو گناہ ہے۔ اور اگر ترک مستحب یا فعل مکروہ سے ظلم کا تعلق ہے تو یہ ظلم گناہ نہیں ہے۔ ترک مستحب اور فعل مکروہ پر ظلم کا اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ ان دونوں صورتوں میں ثواب میں کچھ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ کمی ثواب و قلت اجر پر ظلم کا اطلاق شائع و ذائع ہے۔ جس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی طالب علم ہر امتحان میں اول نمبر کامیاب ہوتا ہو اور کسی ایک امتحان میں وہ دوسرے نمبر پر آجائے تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا کہ اول نمبر نہ آسکا۔ اگر تھوڑی سی محنت اور کر لیتا تو اول نمبر میرے ہاتھ سے نہ جاتا۔ یہ امر بھی ظاہر ہے کہ دوسرے نمبر پر کامیابی گناہ نہیں ہے۔ محض ایک درجہ کی کمی ہے۔ اسی پر انبیاء علیہم السلام کے ظلم کو قیاس کر لینا چاہیے۔ مکروہ کے ترک پر جو اجر تھا وہ اجر فعل مکروہ یا ترک اولیٰ کی صورت میں نہیں ملا۔ اسی کمی اجر کو انبیاء علیہم السلام نے ظلم سے تعبیر کیا ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا — اے رسول ہم نے تم کو کھلی فتح

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ — دی۔ اس لیے عنایت فرمائی کہ تمہارے

ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ — گذشتہ و آیندہ ذنب کی تلافی کر دیں۔

اس آیت میں ذنب گناہ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ اس لیے کہ مغفرت ذنب کی علت و سبب قرار دیا گیا ہے لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ میں لام تعلیلیہ ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ذنب بمعنی گناہ کا سبب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ذنب سے مراد وہ تکالیف لی گئی ہیں جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کفار کے سے پہنچی تھیں۔ اور عدم فتح مکہ کی صورت میں آیندہ پہنچتیں۔ فتح مکہ کی وجہ سے گذشتہ تکالیف خوشی سے مبدل ہو گئیں اور آیندہ پہنچنے والی تکالیف کا انسداد ہو گیا۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے،

فَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ — اپنے ذنب کے لیے استغفار کرو

اس آیت میں ذنب (گناہ کرنا) مصدر ہے۔ مصدر کی اضافت کبھی فاعل کی طرف ہوتی ہے اور کبھی مفعول کی طرف مثلاً ضَرْبُ زَیْدٍ میں زید ضرب کا فاعل بھی ہو سکتا ہے یعنی زید کا کسی کو مارنا اور مفعول بھی ہو سکتا ہے یعنی کسی دوسرے کا زید کو مارنا۔ آیت مذکورہ میں ذنب مفعول کی طرف مضاف ہے جس کی اصل یہ ہے:

فَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِ اُمَّتِكَ اِیَّاكَ — یعنی امت نے جو تمہاری نافرمانیاں کی ہیں امت کے لیے ان نافرمانیوں کے طلب مغفرت کرو

تیسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ — اے رسول اپنے ذنب اور مومنین کے لیے استغفار کرو۔

اس روایت میں بھی ذنب مفعول کی طرف مضاف ہے اور امت کی وہ نافرمانیاں مراد ہیں جو رسول (علیہ السلام) کے متعلق تھیں اور للمؤمنین کے ذریعہ مومنین کا ذکر علیحدہ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ رسول پر ایمان لانے والوں کے گناہ دو قسم کے تھے۔ کچھ گناہ ان کے ذاتی تھے اور کچھ گناہ رسول کی نافرمانیوں سے متعلق تھے۔ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ارشاد ہو رہا ہے کہ مومنین کے دونوں قسم کے گناہوں کی معافی تم مانگ لو۔ لِذَنْبِكَ میں ایمان والوں کی وہ نافرمانیاں داخل ہیں جو رسول (علیہ السلام) کے متعلق تھیں اور للمؤمنین سے ان گناہوں کی طرف اشارہ ہے جو رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی نافرمانیوں سے متعلق نہ تھے۔

مومنین کے دونوں قسم کے گناہوں سے استغفار کا حکم جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ مومنین کے گناہوں کی بخشش میں استغفار رسول کی شرط ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

استغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحیما	اگر وہ لوگ اللہ سے طلب مغفرت کرتے اور رسول ان کے لیے طلب مغفرت کرتا تو اللہ کو توبہ کا قبول کرنے والا رحیم پاتے۔

اس لیے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ایمان لانے والوں کے لیے اُن کے گناہوں کی معافی مانگ لو۔

چوتھے مقام پر ارشاد ہوتا ہے

ووجدک ضالا فهدی	اے رسول اللہ نے تم کو ضال پایا

ھدایت کی۔

اس آیت میں ضالّ کے معنی گمراہی کے نہیں ہیں بلکہ گم شدہ و گمنام کے معنی مراد لیے گئے ہیں لغت میں ضالّ گم راہ و گم نام دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔

الحکمۃ ضالۃ المؤمن	حکمت مومن کی گم شدہ شئی ہے

قرآن مجید میں بھی ضَلَلْتُ و ضَلَلْنَا اکثر مقامات پر اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

پس آیت کا مفہوم یہ ہے:

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ	اے رسول اللہ نے تم کو گمنام پایا
الناس الی معرفتک	تمہیں کوئی پہچانتا نہ تھا پس باری تعالیٰ نے لوگوں کو تمہاری معرفت کرا دی۔

ان آیات کے علاوہ جن آیات کے ظاہری معنی عقل کے خلاف ہیں ان سب میں تاویل ضروری ہے ورنہ عقل و نقل دونوں کو چھوڑنا پڑے گا۔

سہو و نسیان

انبیاء و ائمہ علیہم السلام پر سہو و نسیان طاری نہیں ہوتا کیونکہ جواز سہو و نسیان کی صورت میں انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے پہنچائے ہوئے احکام پر وثوق نہ رہے گا۔ اور احکام خدا یقینی احکام خدا نہ رہیں گے نیز سہو و نسیان ایک ایسا نقص ہے۔ جو قلوب مکلفین سے ان حضرات کی عظمت کے ساقط ہونے کا سبب ہے جس کی وجہ سے ان حضرات کو مخلوق کی اطاعت تامہ حاصل نہ رہ سکے گی۔

قرآن مجید کی جن آیات میں ان حضرات کی طرف نسیان کی نسبت دی گئی ہے۔ ان آیات

میں نسیان بمعنی ترک استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید میں بھی نسیان بمعنی ترک استعمال ہوا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ — ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ دیا جس کے جواب میں اللہ نے ان کو چھوڑ دیا۔

حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے تذکرہ میں نسیان کے معنی

حضرت آدم علیٰ نبینا و آلہٖ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا — آدم سے نسیان ہوا اور ہم نے آدم میں عزم نہیں پایا۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے نسیان ہوا۔

جواب:

فَنَسِيَ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدم بھول گئے بلکہ فَنَسِيَ کے معنی یہ ہیں کہ آدمؑ نے نہی تنزیہی (مکروہ) پر عمل کو ترک کر دیا۔ اور ہم نے آدم علیہ السلام میں عزم نہیں پایا۔ اس آیت میں اگر نَسِيَ کے معنی بھول جانے کے لیے جائیں گے۔ تو بلاغت قرآنیہ ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ بھول جانا آدم علیہ السلام کا اختیاری فعل نہ تھا اور عزم کا نہ ہونا حضرت آدم علیہ السلام کا اختیاری فعل ہے۔ کسی فعل کو بھول جانا اس فعل کے عدمِ عزم کی دلیل نہیں ہے البتہ کسی فعل کو ترک کرنا اس فعل کے عدمِ عزم کو مستلزم ہے پس نَسِيَ بمعنی بھول جانے کے مقابلہ میں لَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (ہم نے آدمؑ میں عزم نہیں پایا) فرمانا خلافِ بلاغت ہے۔ اس آیت سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جس کو ہم تفصیل کے ساتھ

بیان کر چکے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ	اے خضر میرے نسیان پر مجھ سے مواخذہ نہ کیجیے۔

اس آیت میں بھی نَسِیْتُ بمعنی ترکت (میں نے ترک کیا) استعمال ہوا ہے۔ اگر اس آیت میں نسیان بمعنی ترک نہ لیا گیا تو ایک صاحب کتاب (صاحب شریعت) پیغمبر کا نسیان (بھول جانا) عوام الناس کے نسیان سے بڑھ جائے گا۔ ہم اس مقام پر قرآن مجید کی ان آیات کو پیش کرتے ہیں جن میں موسیٰ و خضر کے واقعہ کا تذکرہ ہے۔

قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ	خضر سے موسیٰ نے کہا کہ کیا میں تمہارے
عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا	ساتھ رہوں کہ جو کچھ اللہ نے آپ کو
عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝ قَالَ	تعلیم دی ہے اس میں سے کچھ مجھے بتا
إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝	دیں۔ خضر نے جواب دیا کہ تم ہرگز میرے
وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ	ساتھ صبر نہیں کر سکتے اور جس چیز کی آپ کو
تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۝ قَالَ	خبر نہیں دی گئی اس پر آپ بغیر اعتراض کیے
سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ	کس طرح رہ سکتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا کہ انشاء
صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ	اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور کسی امر
أَمْرًا ۝ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا	میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ خضر نے
تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ	کہا کہ اچھا اگر میرے ساتھ رہنا ہی چاہتے
أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝	ہو تو کسی شے کے متعلق مجھ سے اس وقت

فَانْطَلَقَا حَتّٰى اِذَا رَكِبَا	تک سوال نہ کرنا جب تک میں اس شے
فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا	کو تم سے بیان نہ کروں اس کے بعد دونوں
قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ	چل دیئے یہاں تک کہ ایک کشتی میں سوار
اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ	ہوئے خضر نے اس کشتی میں ایک سوراخ
شَيْئًا اِمْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ	کر دیا موسیٰ نے کہا کہ کیا کشتی میں سوراخ
اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ	کر کے اس کشتی کو ڈبونا چاہتے ہو خضر نے کہا
مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ لَا	کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے
تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ	ساتھ رہ کر صبر پر قادر نہیں ہو سکتے موسیٰ نے
وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ	کہا کہ اے خضر میرے نسیان پر مجھ سے
عُسْرًا ۝ فَانْطَلَقَا حَتّٰى	مواخذہ نہ کیجیے اور میرے امر کو دشوار نہ
اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ	بنائیے پھر دونوں نے سفر اختیار کیا یہاں تک
قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا	کہ ان دونوں کو ایک بچہ ملا خضر نے اس بچے
زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ	کو قتل کر دیا موسیٰ نے کہا کہ اے خضر کیا تم
لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ۝	نے پاکیزہ نفس کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیا۔
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ	تمہارا یہ عمل ناپسندیدہ ہے خضر نے کہا کہ اے
اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ	موسیٰ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے
صَبْرًا ۝ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ	فعل پر بغیر اعتراض کیے رہ ہی نہیں سکتے
عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا	موسیٰ نے کہا کہ اگر اس کے بعد میں آپ کے فعل پر
تُصٰحِبْنِيْ قَدْ بَلَغْتَ	اعتراض کروں تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے آپ

مِنِّي عُذْرًا ۝ فَانْطَلَقَا	نے مجھے انتہائی مہلت دے دی اس
حَتّٰٓى إِذَآ أَتَيَآ أَهْلَ	کے بعد دونوں پھر روانہ ہوئے یہاں تک
قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَآ	کہ ایک بستی میں آئے اور بستی والوں سے خواہش
أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ	کی کہ کچھ کھانے کو دیں۔ بستی والوں نے
يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا	ان کو مہمان رکھنے سے انکار کر دیا ان دونوں
فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ أَنْ	نے اس بستی میں ایک شکستہ دیوار دیکھا جو
يَّنْقَضَّ فَأَقَامَهٗ ؕ	گرنے والی تھی خضر نے پشت کا سہارا دے
قَالَ لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ	کر اس دیوار کو سیدھا کر دیا موسیٰ نے کہا
عَلَيْهِ أَجْرًا ۝ قَالَ هٰذَا	کہ تم چاہتے تو ان سے دیوار کی کچھ اجرت
فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ	لے سکتے تھے۔ خضر نے کہا کہ اے
سورہ کہف آیات	موسیٰ بس اب میں اور تم ساتھ نہیں
از ۷۶ تا ۷۸	رہ سکتے۔

اگر حضرت موسیٰؑ کا بار بار اعتراض کرنا وعدہ کو بھول جانے کی وجہ سے تھا تو اس قسم کی بھول تو عوام الناس کو بھی نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ نبی اور نبی بھی صاحب کتاب و صاحب شریعت اس مقام پر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ حضرت خضر کو قبل وقوع واقعہ یہ علم کس طریقہ سے ہو گیا تھا کہ موسیٰ ان کے فعل پر ضرور اعتراض کریں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے جب ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی تو خضر نے کہا۔

إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ	اے موسیٰؑ تم مجھ پر بغیر اعتراض کیے
صَبْرًا	نہیں رہ سکتے۔

یہ آیت اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ خضر کو موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کرنے کا یقین تھا۔

واقعہ دراصل یہ تھا کہ حضرت خضر شریعت باطنی کے پابند تھے اور حضرت موسیٰ کی شریعت ظاہری تھی۔ خضر کا ہر وہ فعل جو شریعت باطنی کے لحاظ سے تھا حضرت موسیٰؑ کے لیے نبی ہونے کے اعتبار سے قابل اعتراض تھا۔ اسی وجہ سے حضرت خضر نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ تم اور میں یکجا نہیں رہ سکتے میں شریعت باطنی کا پابند ہوں اور تمہاری شریعت ظاہری ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا بار بار اعتراض کرنا و خلف وعدہ کا بھی خیال نہ کرنا بھول جانے کی وجہ سے نہ تھا بلکہ حضرت خضر کا فعل موسیٰ کی شریعت ظاہری کے خلاف ہوتا ہے۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ کا نبی ہونے کے اعتبار سے فرض تھا کہ اپنی شریعت کے خلاف جو فعل بھی دیکھیں۔ اس پر اعتراض کریں۔ لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ کے معنی یہ ہیں کہ اے خضر میں نے اپنی شریعت پر عمل کرتے ہوئے جو تم کو بار بار ٹوکا ہے اور اپنے معاہدہ کو بار بار ترک کیا ہے۔ اس میں میں قابل مواخذہ نہیں ہوں کیونکہ میں نے اپنے فرض منصبی کو ادا کیا ہے اور منصب کی ادائگی قابل مواخذہ نہیں ہوتی۔ اعتراضات سہو و نسیان کی وجہ سے نہ تھے۔

حضرت خضر کے افعال کی توجیہ جس کو خضر نے خود بیان کیا ہے کشتی میں سوراخ کر کے کشتی میں عیب پیدا کر دیا جس کی وجہ سے کشتی بادشاہ کے غصب کرنے سے محفوظ رہی۔ بچے کو اس لیے قتل کیا تھا کہ اس بچے کے ماں باپ مومن تھے یہ بچہ بالغ ہو کر کافر رہتا اور ماں باپ کو قتل کر دیتا۔ دیوار کو بغیر اجرت اس لیے سیدھا کیا تھا کہ اس دیوار کے نیچے دو یتیم بچوں کا خزانہ تھا۔ ان بچوں کے اجداد میں سے ساتویں پشت میں جو جد تھا وہ مومن تھا۔ اس مومن جد کی وجہ سے اللہ نے چاہا کہ یہ دیوار اس وقت تک قائم رہے کہ جب تک یہ یتیم بچے بالغ ہو جائیں۔